زندگی موت اور انسان

آئینۂ قرآنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

عہدِ حاضر میں انسان کے وجود کے جس داخلی تضاد کو اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں واضح کیا لسان العصر اکبر الٰہ آبادی نے کہ ؎

کہا منصور نے خدا ہوں میں ڈارون بولا بوزنا ہوں میں

ہنس کے کہنے لگے مرے اِک دوست فکرِ ہر کس بقدرِ ہمّتِ اوست

لسانُ الملّت علاّمہ اقبالؔ کو اس کے کامل فہم میں کچھ وقت لگا۔ ابتداءً تو انہیں انسان کا صرف خاکی وجُود ہی نظر آیا چنانچہ یہ تک کہہ بیٹھے کہ ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی، جہنّم بھی یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

لیکن بعد میں تدریجاً حقیقت منکشف ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ 'بالِ جبریل' میں فرماتے ہیں ؎

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات ہر دو جہاں سے غنی اُس کا دلِ بے نیاز!

اور آخرِ کار نہ صرف یہ کہ وہ اس قطعی اور حتمی نتیجے تک پہنچ گئے کہ ہماری اصل ذات یا انا یا خودی تو ہے ہی خالصتہً نوری الاصل ؎ .

نقطۂ نوری کہ نامِ او خودی است زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است!

بلکہ اس حقیقت کو بھی پا گئے کہ ہماری ہستی کا یہ نورانی عنصر در اصل خود خدا ہی کی ایک تجلّی ہے:

؎ ہے نورِ تجلّی بھی اسی خاک میں پنہاں غافل تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے

اور دم چیست ؟ پیام است! شنیدی نہ شنیدی ؟

در خاکِ تو یک جلوۂ عام است نہ دیدی !!

دیدن دگر آموز ۔ شنیدن دگر آموز

کاش کہ عہدِ حاضر کے مسلمان کو اس " دیدن دگر" اور "شنیدن دگر" کی توفیق مل جائے

خدایا آرزو میری یہی ہے مرا نورِ بصیرت عام کر دے

زندگی موت اور انسان

آئینۂ قرآنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

شائع کردہ
مکتبہ مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور
۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

نام کتاب ــــــــــ زندگی، موت اور انسان، آئینہ قرآنی میں
اشاعت اول ــــــــــ فروری 1988ء
حالیہ اشاعت ــــــــــ اکتوبر 2003ء
تعداد اشاعت ــــــــــ 2200
ناشر ــــــــــ ناظم نشر واشاعت، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور
مقامِ اشاعت ــــــــــ 36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون: 03-5869501
مطبع ــــــــــ شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور
قیمت ــــــــــ 12 روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میری جو دو تحریریں اس کتابچے میں شامل ہیں اُن میں سے پہلی تحریر اکیس بائیس سال پُرانی ہے۔ اس لیے کہ یہ اوائل ۱۹۶۶ء میں اس زمانے میں لکھی گئی تھی جب میں دوبارہ لاہور منتقل ہوا ہی تھا اور میری زندگی کے اس دَور کا آغاز ہونے والا تھا جس کے اہم نشاناتِ راہ ہیں پیشۂ طب سے علیحدگی، مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کی تاسیس اور تنظیم اسلامی کا قیام! ——— اُس زمانے میں مولوی محی الدین سلفی مرحوم و مغفور ہفت روزہ "الاعتصام" کے ادارۂ تحریر سے وابستہ تھے۔ انہوں نے اشاعت کے لیے کسی مضمون کی فرمائش کی ——— میں کبھی اپنے زمانۂ طالب علمی میں تو اسلامی جمعیتِ طلبہ کے ہفت روزہ پرچے "عزم" میں لکھتا رہا تھا اور ۱۹۵۶ء میں تحریکِ اسلامی سے شدید ذہنی اور قلبی وابستگی کے باعث سخت اعصابی دباؤ کے تحت "تحریکِ جماعتِ اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" نامی طویل تحریر بھی میرے قلم سے نکل چکی تھی لیکن اس کے بعد سے مسلسل دس سال اس طرح گزر گئے تھے کہ کسی کو ذاتی خط لکھنے کے لیے بھی شاید ہی قلم ہاتھ میں لیا ہو ——— لہٰذا میں معذرت کرتا رہا ——— لیکن جب ان کا اصرار بہت بڑھا تو ایک روز اچانک قلب و ذہن کی کسی خاص کیفیت میں یہ تحریر قلم سے صادر ہو گئی۔ "الاعتصام" جماعتِ اہلحدیث کا ترجمان تھا اور مجھے یقین تھا کہ یہ تحریر اس میں ہرگز نہیں چھپ سکے گی۔ لیکن محی الدین سلفی مرحوم نے اسے شائع کر دیا ——— مجھے حیرت ہوئی کہ اس پر انہیں متعدد خطوط تعریف و تحسین پر مشتمل موصول ہوئے۔ جن میں سے بعض انہوں نے مجھے بھی دکھائے، ان میں سے ایک خط ملک حسن علی جامعی شرقپوری نے تحریر فرمایا تھا جس میں انہوں نے اس تحریر کی بہت دل کھول کر تعریف کی تھی اور اسے حکمتِ قرآن اور فلسفۂ اقبال کا نچوڑ قرار دیا تھا ——— اس اثناء میں میرے ذہن میں "حقیقتِ انسان" کے عنوان سے اس کی دوسری قسط کا ہیولیٰ

بھی تیار ہو گیا تھا ــــــــ بلکہ اس کا ابتدائیہ قلمبند بھی ہو گیا تھا ــــــــ لیکن اُدھر اگست ۶۶ء میں جب "میثاق" کا پہلا پرچہ میری ادارت میں شائع ہوا۔ اور میں نے اپنی 'الاعتصام' میں شائع شدہ تحریر کو بھی اُس میں شامل کر دیا تو مولانا امین احسن اصلاحی نے اسے ناپسند فرمایا کہ یہ 'ابوالکلامی انداز' ہے ــــــــ اس کا زمانہ گزر چکا!' 'میثاق، چونکہ اس وقت انہی کے "زیر سرپرستی" شائع ہو رہا تھا لہٰذا میں نے ان کے جذبات کا احترام کیا ــــــــ اور اس طرح اُس دوسری قسط کی تکمیل و تسوید کی نوبت نہ آسکی۔ (بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے بعد اس طرز کی بس ایک ہی تحریر میرے قلم سے اور نکلی جو 'راہِ نجات' نامی کتابچے میں شامل ہے) تاہم اس کے بعض نکات گاہے بگاہے میرے ذہن میں کلبلاتے رہے۔

اواخر ۸۴ء میں اچانک اس 'کلبلاہٹ' نے زور کیا اور اس کا ایک حصہ ذہن سے بذریعۂ قلم قرطاس پر منتقل ہو گیا تو خیال آیا کہ اگر اسے شائع کر دیا جائے تو شاید تکمیل کا فطری تقاضا دوسری مصروفیات میں سے وقت نکالنے پر آمادہ کر سکے۔ چنانچہ اوّلاً 'حکمتِ قرآن' کے نومبر ۸۴ء کے شمارے میں دوبارہ "حقیقتِ زندگی" اور دسمبر ۸۴ء میں "حقیقتِ انسان" کی قسطِ اوّل اشاعت ہوئی۔ اس کے بعد الحمدللہ کہ مارچ اپریل ۸۴ء کے مشترک شمارے میں "حقیقتِ انسان" کی دوسری قسط بھی شائع ہو گئی ــــــــ لیکن افسوس کہ مضمون طوالت اختیار کر گیا اور اس کی تکمیل کی نوبت تاحال نہیں آسکی۔

حال ہی میں یہ خیال آیا کیوں نہ "حقیقتِ زندگی" اور "حقیقتِ انسان" کی قسطِ اوّل کو تو ایک کتابچے کی صورت میں شائع کر ہی دیا جائے۔ شاید کہ کچھ ذہین اور حساس نوجوانوں کو اپنی حقیقت کا سراغ مل جائے اور اُن کے اندر کا سویا ہوا انسان جاگ اُٹھے!!

خاکسار

لاہور - ۱۶؍ فروری ۸۸ء

حقیقتِ زندگی

زندگی محض "عناصر میں ظہورِ ترتیب"[1] ہی کا نام ہے یا اس "پردۂ زنگاری" میں کوئی حقیقتِ کُبریٰ "معشوق" بنی چھپی بیٹھی ہے[2]؟ اسی طرح موت زندگی کے خاتمے کا نام ہے یا یہ بجائے خود زندگی ہی کا ایک "وقفہ" ہے! ع: "یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر!"[3]

ہم اپنی زندگی کو "امروز۔ و۔ فردا" کے پیمانوں سے ناپیں اور حسرت سے پکار اُٹھیں کہ؛

ے "عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن   دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں"

یا اسے ع: "جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں" مانیں اور اپنی ابدیت کے سرور انگیز تصوّر سے شادکام ہوں؟[4]

اس مسئلے کے حل کا سارا دارومدار اس پر ہے کہ آیا ہم محض "عالمِ محسوسات" تک محدود رہنے کا فیصلہ کرتے ہیں اور صرف 'حواسِ خمسہ' کی محدود دریافتوں پر اکتفا کرتے ہیں یا عقل و وجدان کی قوتوں کو بھی کام میں لاتے ہیں اور "اپنے من میں ڈوب کر" "سراغِ زندگی" کو پانے کی سعی کرتے ہیں۔

'عالمِ محسوسات' اور 'حواسِ خمسہ' تک محدود رہیے تو زندگی بس پیدائش سے موت تک کے وقفے کا نام ہے۔ قرآنِ مجید ان 'مومنین تجربہ و شہود' کے تصوّرِ حیات کو ان الفاظ

---

1. "زندگی کیا ہے، عناصر میں ظہورِ ترتیب   موت کیا ہے، انہی اجزا کا پریشاں ہونا"
2. "چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستم گاری میں   کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں"
3. "موت اِک زندگی کا وقفہ ہے   یعنی آگے بڑھیں گے دَم لے کر"
4. "تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ   جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی"

یں بیان فرماتا ہے:

اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا وَمَا	ہمارے لیے زندگی نہیں مگر یہی دنیا کی
نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ۔ (الانعام)	اور ہم کو پھر نہیں زندہ ہونا۔
اور مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ	کچھ نہیں بس یہی ہمارا جینا ہے دنیا کا۔
وَنَحْیَا وَمَا یُهْلِکُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ	ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور نہیں ہلاک
(الجاثیہ)	ہوتے مگر صرف (گردش) زمانہ سے!

اور اُن کے ذہن کی پستی اور علم کی کوتاہی پر ان الفاظ میں تبصرہ فرماتا ہے:

یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ	یہ لوگ صرف دنیوی زندگی کے ظاہر
الدُّنْیَا۔ (الروم)	کو جانتے ہیں۔
اور ذٰلِکَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ۔ (النجم)	بس یہیں تک پہنچ ہے اُن کی علم میں!

کیا واقعی زندگی بس اِسی مختصر سے وقفے کا نام ہے؟ ہمارے حواس خمسہ یقیناً ولادت کے ماقبل اور موت کے مابعد کے بارے میں بالکل لاچار و بے بس ہیں لیکن کیا عقلِ انسانی اسے باور کرتی ہے؟ اور وجدان اسے قبول کرتا ہے؟؟ ذرا آنکھیں بند کر کے اِس وسیع و عریض کائنات کی عظمت و وسعت کا تصور کرو! پھر سوچو کہ اِس کائنات کا مرکزی وجود، انسان ہے سلسلۂ تخلیق کا کمال! ارتقائے حیات کی آخری منزل!

تو کیا اس کی حقیقت بس یہی کچھ ہے کہ بچپن کے "لَعِبٌ وَّلَهْوٌ"[1] اور بڑھاپے کے "لِکَیْلَا یَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَیْئًا"[2] کے مابین ایک تھوڑے سے وقفے کے

---

[1] اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ..... الآیہ (سورۃ الحدید)۔
جان لو کہ دنیا کی زندگی لعب و لہو ہے ..... الخ

[2] وَمِنْکُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰٓی اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِکَیْلَا یَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَیْئًا (سورۃ الحج)
اور تم میں سے کچھ لوٹائے جاتے ہیں نکمّی عمر کو تا کہ نہ جانیں جاننے کے بعد کوئی چیز۔

ہوش وشعور کا نام حیاتِ انسانی ہے گویا۔ ع : " اک ذرا ہوش میں آنے کے خطاوار ہیں ہم "

جو کوئی "حیاتِ انسانی" کے اِس تصور پر مطمئن[1] ہوسکتا ہو، وہ ہو۔ آخر سطحِ ارض پر انسان ہی تو نہیں بستے۔ لاتعداد حیوانات، چرند پرند بھی یہیں بس رہے ہیں، تو کون سے تعجب کی بات ہے کہ خود انسانوں میں ایک گروہِ کثیر انسان نما حیوانوں ہی کا ہو!

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا	وہ دِل رکھتے ہیں لیکن غور نہیں کرتے،
وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا	آنکھیں رکھتے ہیں، پر دیکھتے نہیں،
وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا	کان رکھتے ہیں، پر سُنتے نہیں۔ وہ
أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ	حیوانوں کی مانند ہیں بلکہ اُن سے بھی
(سورۃ الاعراف)	گئے گزرے۔

اپنی حقیقت سے بے خبر اور اپنی عظمت سے غافل یہ انسان نما حیوان درحقیقت "اِک ذرا ہوش میں آنے کے" بھی بس مغالطے ہی میں مبتلا ہیں۔ وحیِ الٰہی تو انہیں زندہ ہی تسلیم نہیں کرتی۔

فَإِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ	کیونکہ تم مُردوں کو نہیں سُنا سکتے اور نہ ہی
الصُّمَّ الدُّعَاءَ (سورۃ الرّوم)	بہروں کو اپنی پکار سُنا سکتے ہو۔

جن کا حال یہ ہو کہ ع : "رُوح سے تھا زندگی میں بھی تہی جن کا جسد" وہ کب "حیاتِ انسانی" کے لطیف حقائق کا ادراک کر سکتے ہیں! قفسِ حواس کے اِن زندانیوں کو کون باور کرا سکتا ہے کہ

ے "ایسے کچھ تار بھی ہیں سازِ حقیقت میں نہاں چھُو سکے گا نہ جنہیں زخمۂ مضرابِ حواس"

ہاں! جن کا ذہن اس "چار دن" کی "عمرِ دراز[2]" پر مطمئن نہ ہوتا ہو، جن کے جسدِ خاکی میں

---

[1] وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا بِهَا۔ (سورۃ یونس)
اور راضی ہو گئے حیاتِ دُنیوی سے اور اسی پر مطمئن ہو گئے۔

[2] عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں (ظفرؔ)

حیاتِ حقیقی کروٹیں لے رہی ہو اور جنہیں خود اپنے اندر ہی کی کوئی چیز اپنی عظمت کی جانب اشارے کرتی محسوس ہو اُن کے "ضمیر" پر جب "نزولِ کتاب" ہوتا ہے تو حقیقتِ حیات کی "گرہ"[1] کھلتی ہے اور وحیٔ الٰہی کی بدلی سے حقائق کی بارش ہوتی ہے تو اُن کی عقل و وجدان کی پیاسی زمین کو ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے اُسے بعینہٖ وہی چیز مل گئی جس کی اُسے پیاس تھی۔ اور تب وہ حیاتِ انسانی جو حواسِ خمسہ کی "بندگی" میں گھٹ کر جوئے کم آب نظر آتی تھی ذہنِ انسانی کے اُن کے چنگل سے "آزاد" ہوتے ہی ایک "بحرِ بیکراں"[2] کی صورت اختیار کرلیتی ہے اور یہ حیاتِ دُنیوی، جو لاعلمی اور بے خبری میں "اصل حیات" قرار پاگئی تھی، سُکڑ اور سمٹ کر اصل کتابِ حیات کے محض ایک دیباچے اور مقدمے کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ صاعقۂ حق کوند کر اعلان کرتا ہے:

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ۔ (سورۃ العنکبوت)	اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔

اور انسانوں کے اس عظیم ہجوم پر نظر ڈالتے ہوئے جو حیاتِ دنیوی کے لہو و لعب ہی کو اصل حیات قرار دیئے بیٹھا ہے، حسرت کے ساتھ پکارتا ہے۔

لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۔	کاش کہ یہ جانتے!

پھر کبھی ڈانٹا جاتا ہے:

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ (سورۃ القیامہ)	کچھ نہیں بس تم دُنیا سے محبت کرتے ہو اور آخرت کو تج دیتے ہو۔

اور کبھی شکوہ کیا جاتا ہے:

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا	تم حیاتِ دنیوی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ

---

[1] تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشّاف (اقبال)

[2] بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی (〃)

وَالْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی۔ (سورۃ الاعلیٰ)   آخرت بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی۔

اللہ! اللہ! کیا انقلاب ہے، کہاں یہ ذہن کی تنگی کہ زندگی بس یہی زندگی ہے اور کہاں یہ وسعتِ نظر کہ حیاتِ انسانی ابدی اور سرمدی ہے جس کی کوئی انتہا نہیں[1]! کُجا یہ مایُوس کُن تصور کہ موت سلسلۂ حیات کا اختتام ہے اور کُجا اِس حقیقت کا ادراک کہ موت تو اصل "شہرِ زندگی" کا 'شاہ درہ' ہے۔

بدقسمتی سے اُخروی زندگی کے 'ماننے والوں' میں بھی بہت کم بلکہ شاذ ہی ایسے ہیں جو اُس کے 'جاننے والے' ہوں۔ اُس کا 'ماننا' جس قدر آسان ہے 'جاننا' اُسی قدر دشوار ہے۔ 'ماننا' تو محض توارث سے بھی مل جاتا ہے لیکن 'جاننے' کے لیے اپنے ظرفِ ذہنی کو وسیع و عمیق کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اس کا موقع آج کی مادّہ پرست دُنیا میں کسے نصیب ہے!

ماننے والوں کی ایک غالب اکثریت نے 'حیاتِ دُنیوی' کو اصل کتاب 'جان' کر 'حیاتِ اُخروی' کو بس اس کے تتمّے اور ضمیمے کی حیثیت سے 'مانا' ہے۔ حالانکہ 'جاننا' یہ چاہیے کہ اصل کتابِ حیات تو موت کے بعد کھلنے والی ہے۔ یہ حیاتِ دُنیوی تو بس اُس کا ایک دیباچہ ہے یا مقدّمہ! وہ حقیقت ہے اور یہ محض اُس کا ایک عکس۔ وہ ابدی ہے اور لامتناہی اور یہ عارضی ہے اور مختتم، وہ حقیقی اور واقعی ہے اور یہ اُس کے مقابلے میں محض کھیل تماشا بلکہ "متاعِ غرُور" —— آیاتِ بیّنات!

وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَۃِ اِلَّا مَتَاعٌ۔ (سورۃ الرّعد)   اور دنیا کی زندگی کچھ نہیں آخرت کے آگے مگر متاعِ حقیر۔

فَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا فِی   سو کچھ نہیں نفع اُٹھانا دنیا کی زندگی کا

---

[1] ع "تیری جو ابتدا نہیں میری بھی انتہا نہیں!"

اَلْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِیْلٌ۔ (سورۃ التوبہ)	آخرت کے مقابلے میں مگر تھوڑا۔
وَمَا هٰذِهِ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ۔ (سورۃ العنکبوت)	اور یہ دنیا کا جینا تو بس جی بہلانا اور کھیلنا ہے۔
وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ۔ (سورۃ الحدید و آلِ عمران)	اور دُنیا کی زندگی تو صرف دھوکے کا سامان ہے۔

اِسی حقیقت پر شاہد ہیں۔

لیکن 'حیاتِ دُنیوی' کی یہ ساری بے بضاعتی اور کم مائگی 'حیاتِ اُخروی' کے مقابلے ہی میں ہے۔ ورنہ بجائے خود یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ ذرا غور کرو جو کتابِ حکیم "موت" کو بھی ایک مثبت حقیقت قرار دے جو 'حیات' ہی کی طرح تخلیق کے مراحل سے گزری ہے[1] وہ حیاتِ دنیوی کو کب بے حقیقت ٹھہرا سکتی ہے۔ یہ بے حقیقت صرف اُس وقت بنتی ہے جب اُس کا تقابل حیاتِ اُخروی سے کیا جاتے اور متاعِ غرور اُس وقت قرار پاتی ہے جب نگاہیں اُس پر اِس طور سے مرکوز ہو جائیں کہ دل و دماغ حیاتِ اُخروی سے محجوب ہو جائیں۔ یہی رمز ہے قرآنِ حکیم کے اِس تبصرے میں کہ: یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا —— یہ مومنینِ حیاتِ دُنیوی، خود حیاتِ دُنیوی کی حقیقت سے کب واقف ہیں۔ اِس کا بھی بس "ظاہر" ہی اُن کی نگاہوں کے سامنے ہے خود اس کی حقیقت آشکارا ہو جائے تو حیاتِ انسانی کے جملہ حقائق تک رسائی کی راہیں روشن ہو جائیں۔

قرآنِ حکیم نے "حیاتِ دُنیوی" کو 'حیاتِ انسانی' کا ایک امتحانی وقفہ قرار دیا ہے:

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ	بنایا جینا اور مرنا تاکہ تم کو جانچے کون تم

---

[1] خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیَاتَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ (سورۃ الملک)

بنایا جینا اور مرنا تاکہ تم کو جانچے کون تم میں اچھا کرتا ہے کام۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ (سورۃ الملک) میں اچھا کرتا ہے کام۔

یعنی یہ امتحان گاہ ہے، نتائج آخرت میں برآمد ہوں گے۔ ؎

قلزمِ ہستی سے تُو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اِس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

یہ گھڑی محشر کی ہے، تُو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو آخرت کی کھیتی سے تعبیر فرمایا ہے "اَلدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْاٰخِرَۃِ" ـــــ غرض یہ کہ آخرت سے ملا کر دیکھو تو حیاتِ دُنیوی بھی ایک ٹھوس حقیقت ہے، بصورتِ دیگر اس کا کوئی حقیقی وجُود ہی نہیں رہ جاتا۔

آخرت سے قطع نظر، حیاتِ دُنیوی کی حقیقت اس کے سوا اور کیا ہے کہ:

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا — جان رکھو کہ دنیا کی زندگی یہی ہے کھیل
لَعِبٌ وَّلَھْوٌ وَّزِیْنَۃٌ وَّتَفَاخُرٌۢ — اور تماشا اور بناؤ اور بڑائیاں کرنی آپس
بَیْنَکُمْ وَتَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَ — میں اور بہتات ڈھونڈنی مال کی اور اولاد
الْاَوْلَادِ۔ (سورۃ الحدید) — کی۔!!

لیکن بچپن کے کھیل کود، نوجوانی کی آرائش و زیبائش اور بناؤ سنگھار، شباب کے فخر و مباہات اور کہولت کے تکاثرِ اموال و اولاد کے ان ہی ادوار سے گزرتے ہوئے "اِک ذرا ہوش میں آنے" سے حیاتِ دُنیوی ایک حقیقتِ کبریٰ اور نعمتِ غیر مترقبہ کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اور اگر یہ ہو جائے تو بس یہی حاصلِ حیات ہے۔ اگرچہ یہ ایک دردناک حقیقت ہے کہ یہ "ہوش" کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ وَمَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا ذُوْحَظٍّ عَظِیْمٍ[1]۔

ہوش میں آ کر اگر حقیقت کی کوئی جھلک دیکھ پاؤ اور پھر اُسی کے رُخِ زیبا کے پرستار اور اُسی کی زُلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو جاؤ تو بس یہی سرمایۂ حیات ہے، پھر جب تک یہاں رہو گے چین اور سکون سے رہو گے اور "اَحَقُّ بِالْاَمْنِ"[2] قرار پاؤ گے، موت حجلۂ عروسی

---

[1] "اور یہ بات ملتی ہے اُسی کو جس کی بڑی قسمت ہو۔" (سورۃ حٰمٓ السجدہ) (ترجمہ شیخ الہندؒ)
[2] "فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ" ۔ (سورۃ الانعام)

میں داخلے سے زیادہ خوش آئند نظر آئے گی اور اُس کا استقبال مسکراتے ہوئے کروگے ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم　　چوں مرگ آید تبسّم برلبِ اوست[1]

اور وہاں اُٹھو گے تو اِس حال میں کہ:

نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ　　اُن کی روشنی دوڑتی ہوگی اُن کے آگے

وَبِاَيْمَانِهِمْ۔ (سورۃ الحدید و سورۃ التحریم)　　اور اُن کے داہنے۔

اور پھر ابدالآباد تک امن اور سکون ہی میں نہیں رہو گے بلکہ تمہاری مشاہدۂ حق کی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی ہوئی پیاس کو آسودگی عطا کی جائے گی۔ یہاں تک کہ تم "حقیقت الحقائق" اور "جانِ جاناں" کا مشاہدہ کروگے!

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا　　کتنے منہ اُس دن تازہ ہیں اپنے رَبّ

نَاظِرَةٌ (سورۃ القیامہ)　　کی طرف دیکھنے والے۔

اور اگر ہوش میں نہ آئے، زمینی خواہشات[2] ہی میں غلطاں و پیچاں رہے اور اوندھے[3] منہ پڑ کر پستی ہی پر نگاہوں کو جمائے رکھا اور یہاں کی جھوٹی مسرّتوں اور آسودگیوں ہی کی تلاش میں سرگرداں رہے تو یہ زندگی تمناؤں اور آرزوؤں کے "بَحْرٍ لُّجِّيٍّ" میں دیوانہ وار ہاتھ پاؤں مارتے ہی بیت جائے گی، جہاں "ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ" کے سوا کچھ نہیں۔

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ　　یا جیسے اندھیرے گہرے دریا میں چڑھی

مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ　　آتی ہے اس پر ایک لہر، اس پر ایک

---

[1] تمہیں بتاؤں کہ مردِ مومن کی نشانی کیا ہے، جب موت کا وقت آتا ہے تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔ اقبالؔ

[2] وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ (سورۃ الاعراف)
"مگر وہ تو ہو رہا زمین کا اور پیچھے ہو لیا اپنی خواہشوں کے۔" (ترجمہ شیخ الہند)

[3] اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖۤ اَهْدٰۤى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ (سورۃ الملک)
(بھلا ایک جو چلے اَوندھا اپنے منہ کے بل وہ سیدھی راہ پائے یا جو چلے سیدھا ایک سیدھی راہ پر)

سَحَابٌ۔ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ (سورۃ النور) — اور لہر اور اُس پر بادل، اندھیرے ہیں ایک پر ایک۔

پھر مرو گے اُس پیاسے کی موت جو سراب کو پانی سمجھ کر دیوانہ وار دوڑتا رہا حتّٰی کہ انتہائی حسرت و یاس کی حالت میں جان دے دی۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ — اور جو لوگ منکر ہیں اُن کے کام جیسے ریت

بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً — جنگل میں، پیاسا جانے اُس کو پانی یہاں

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا — تک کہ جب پہنچا اس پر اُس کو کچھ نہ پایا

وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ — اور اللہ کو پایا اپنے پاس تو اس نے پورا

حِسَابَهٗ۔ (سورۃ النور) — چکا دیا اس کا حساب۔

اور وہاں اٹھو گے اِس حال میں کہ زبان پر رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى[1] کا شکوہ ہو گا۔ اور پھر رہو گے ابدالآباد تک اِس حال میں کہ نہ زندوں میں ہو گے نہ مُردوں میں۔

ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى[2] — پھر نہ مرے گا اُس میں نہ جیے گا۔

نہ عذاب کی سختی جینے ہی دے گی اور نہ موت ہی آئے گی کہ اُس سے چھٹکارا دلا دے۔

لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ[3] — نہ چکھیں گے وہ اُس میں موت۔

گویا دُنیا اور آخرت میں تضاد نہیں توافق ہے اِغلط سمجھا جنہوں نے انہیں ایک دوسرے سے مختلف سمجھا۔ یہ دونوں باہم دگر پیوست وہم آغوش ہیں، ایک ہی حیاتِ انسانی کا تسلسل ان میں جاری ہے۔ جس نے یہاں دیکھا وہی وہاں بھی دیکھے گا، جو یہاں "اعمیٰ" رہا وہ وہاں "اعمیٰ" ہی نہیں بلکہ "اَضَلُّ سَبِيْلًا" ہو گا۔

وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ — اور جو کوئی رہا اِس جہان میں اندھا سو

---

[1] اے رَبّ کیوں اُٹھایا تو نے مجھے اندھا؟ (سورۃ طٰہٰ)

[2] سورۃ الاعلیٰ [3] سورۃ الدخان

فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی وَاَضَلُّ — وہ پچھلے جہان میں بھی اندھا ہوگا اور بہت

سَبِیْلًا۔ (سورۃ بنی اسرائیل) — دُور پڑا ہوا راہ سے۔

اور حقائق سے جیسے یہاں محجوب رہا ویسے ہی "حقیقتِ کبریٰ" کے مشاہدے سے وہاں محروم رہے گا:

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ — کوئی نہیں! وہ اُس دن اپنے رب سے

لَّمَحْجُوْبُوْنَ (سورۃ المطففین) — روک دیئے جائیں گے۔

دیکھیں اس حیاتِ مُستعار کی عظمت! اور اس "اِک ذرا ہوش میں آنے" کی اہمیت تبھی تو وحیٔ الٰہی بار بار پکارتی ہے: "لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ"۔

قرآنِ حکیم بار بار پوچھتا ہے:

هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ — کب برابر ہو سکتا ہے اندھا اور

(سورۃ الانعام) — دیکھنے والا۔

هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ — کوئی برابر ہوتے ہیں سمجھ والے، اور

وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (سورۃ الزمر) — بے سمجھ۔!!

حقیقت یہ ہے کہ اصل فرق 'علم' اور 'جہل' ہی کا تو ہے۔ بالکل صحیح کہا تھا جس نے کہا تھا: "علم نیکی ہے اور جہالت بدی" انسانوں کے اِس جمِ غفیر پر نگاہ ڈالو جو زمین میں بس رہا ہے اور دیدۂ بینا کو وا کرو۔ یہ ساری جہل ہی کی تو بساط پھیلی ہوئی ہے! کون سے تعجب کی بات ہے اگر پیدائش سے موت تک کے وقفے ہی کو 'زندگی' سمجھنے والے انسان نما حیوانوں کا یہ ہجوم چھوٹی چھوٹی چیزوں پر لڑے اور کٹ مرے، ایک دوسرے پر جھپٹے اور غرّائے۔ بالکل ٹھیک دیکھا تھا اُس صاحبِ چشمِ حقیقت بین نے جس نے انسانوں کی بستی میں بجائے انسانوں کے کُتّوں، بھیڑیوں اور

سؤروں کو چلتے پھرتے دیکھا تھا۔[1] اِنْ ھِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا کے جہلِ مرکّب کے بطن سے حرص ولالچ، حسد وبغض، غیظ وغضب، دشمنی وعداوت کے سوا اور کیا جنم پا سکتا ہے؟ یہ چھوٹی مسرّتوں اور آسودگیوں کی تلاش میں سرگرداں، حقیر سی آرزوؤں اور تمنّاؤں کے پھندوں میں گرفتار اور طولِ امل کے سراب پر دم توڑتے ہوئے انسان اسی تصورِ حیات کا شاہکار تو ہیں! ذرا سوچو اس جہل نے "احسن تقویم" میں تخلیق پائے ہوئے انسان کو کیسے "اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ" بنا کر رکھ دیا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ	ہم نے بنایا آدمی بہترین اندازے پر،
تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ	پھر پھینک دیا اُس کو نیچوں سے
سَافِلِیْنَ۔ (سورۃ التین)	نیچے۔

یہ کیسی چھوٹی چھوٹی اور حقیر سی چیزوں کو پا کر خوش ہی نہیں ہو جاتا اترانے لگتا ہے اور اکڑ کر چلنا شروع کر دیتا ہے اور کتنی چھوٹی چھوٹی تکالیف اور محرومیوں پر حسرت و یاس کی تصویر بن کر رہ جاتا ہے۔

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ	اور جب ہم آرام بھیجیں انسان پر تو ٹال
اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ وَاِذَا مَسَّهُ	جائے اور بچائے پہلو اور جب پہنچے اُس
الشَّرُّ كَانَ يَئُوْسًا (سورۃ بنی اسرائیل)	کو بُرائی تو رہ جائے مایوس ہو کر۔

"جہل" کے یہ سارے شاہکار، تمہاری نگاہوں کے سامنے ہیں اور اُن کا مشاہدہ تم

---

[1] مولانا احمد علی لاہوریؒ کا مشہور واقعہ ہے کہ جوانی کے دَور میں ایک روز کشمیری بازار میں گھوم رہے تھے کہ ایک مجذوب نے اُن سے کہا کہ "میں کسی انسان سے ملنا چاہتا ہوں، کیا تم پتہ بتا سکتے ہو؟" مولانا فرماتے ہیں کہ اس پر میں نے کہا کہ "کیا تمہیں اس بھرے بازار میں کوئی انسان نظر نہیں آتا؟" جواباً اس مجذوب نے چاروں طرف نگاہ گھما کر کہا: "کہاں ہیں انسان؟" مولانا فرماتے ہیں کہ اس پر دفعتہً خود میری کیفیت یہ ہو گئی کہ بازار میں چاروں طرف انسانوں کے بجائے کتّے اور بھیڑیئے، بندر اور خنزیر ہی نظر آنے لگے۔ یہ کیفیت بس تھوڑی ہی دیر قائم رہی۔ اس کے بعد پھر بازار انسانوں سے بھرا نظر آنے لگا، اور وہ مجذوب بھی نظروں سے غائب ہو گیا!

بچشمِ سر کر سکتے ہو، لیکن 'علم' کے 'پیکر' کو دیکھنے کے لیے تمہیں اپنی چشمِ تصوّر کو وا کرنا ہوگا۔ ذرا اندازہ تو کرو اس ذہن کی وسعت کا جو حیاتِ دنیوی کو بس ایک سفر کا درجہ دے، جس کی منزل موت کی سرحد سے آگے، بہت آگے ہو۔ ؎

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مُسلماں کی!

"کُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيْبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ"[1]

جو یہاں کی جھوٹی مسرتوں اور حقیر سی لذتوں پر "مَالِيْ وَلِلدُّنْيَا"[2] کی نگاہِ غلط انداز ڈالتا ہُوا حیاتِ اُخروی کی اِن معنوی اور حقیقی نعمتوں پر نگاہ جمائے بڑھا چلا جاتا ہے "مالا عین رأت ولا اُذنٌ سمعت وما خطر علیٰ قلب بشر"[3] یہی تو ہیں حقیقت کے شناسا، قلبِ زندہ اور دیدۂ بینا کے مالک، روحِ حیات سے ہم آغوش اور حقیقت کے جمالِ جہاں تاب کے پرستار، یہ جیتے ہیں تو "حق" کا نشان بن کر اور مرتے ہیں تو حقیقت کی نشان دہی کرتے ہوئے۔ ؎

جب وقتِ شہادت آتا ہے دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں[4]

دُنیا میں انہیں "احدی الحسنیین"[5] کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور موت ان کے لیے حیاتِ جاوید کا پیغام لے کر آتی ہے: "بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ"[6]

---

[1] حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: "رہو دنیا میں ایسے کہ گویا تم اجنبی ہو یا راہ چلتے مسافر!"

[2] حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: "مالی وللدنیا، ما انا فی الدنیا الا کراکب استظل تحت شجرۃ ثم راح وترکھا۔" (مجھے دنیا سے کیا سروکار! دنیا میں میرا حال تو اس سوار سے زیادہ نہیں ہے جو ایک درخت کے سائے ذرا دم لے، پھر اُسے چھوڑ کر چل دے)

[3] حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم: جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سُنا اور نہ اُن کا ادراک کسی انسان کے قلب کو حاصل ہوا۔

[4] جگر کا شعر، پہلا مصرع ہے: جو حق کی خاطر جیتے ہیں مرنے سے کہیں ڈرتے ہیں جگر

[5] قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَا إِلَّا إِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ (سورۃ التوبہ)
(کہہ دو تم کیا اُمّید کرو گے ہمارے حق میں مگر دو خوبیوں میں سے ایک کی)

[6] "بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے ربّ کے پاس کھاتے پیتے" (سورۃ آلِ عمران)

یہ ہے کرشمہ اس حقیقت کے علم کا کہ حیاتِ انسانی ابدی ہے۔ درختوں کو پھلوں سے پہچاننے والو! کوئی اندازہ کر سکتے ہو اس شجرِ حیات کی عظمت کا جس کا تصوّر ذہن کی اس وسعت، نگاہ کی اس بلندی، اور کردار کی اُس پختگی کے برگ و بار لاتا ہے: "اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ"[1]

اور ابھی یہ تو ایک ہی رُخ ہے۔ "عظمتِ حیات" کی تصویر کا دوسرا رُخ ابھی باقی ہے ابدیّت کے رُخ کے "جاننے" والے چاہے کم ہوں۔ اُس کے "ماننے" والے بہت ہیں لیکن تصویر کے اس دوسرے رُخ کو تو شاذ ہی کسی نے دیکھا ہے۔

وحیٔ الٰہی نے جہاں "حیات بعد الممات" کے حقائق کو اُجاگر کیا ہے، وہاں حیات قبل الولادت" کی حقیقت کو بھی بالکل مخفی نہیں رکھا۔ اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ اس کا اظہار "بطرزِ خفی" کیا ہے۔ لیکن اس کا سبب بالکل معقول اور بادنیٰ تأمّل معلوم ہو جانے والا ہے۔ کتابِ الٰہی "هُدًى لِّلنَّاسِ"[2] ہے اور اس نے انسانوں کے مختلف طبقات اور گروہوں کی ضرورت کو گہری حکمت کے ساتھ پیشِ نظر رکھا ہے۔ "حیات بعد الممات" کا علم انسانوں کی ایک عظیم اکثریّت کی "حیاتِ دنیوی" کی عملی اصلاح کے لیے ناگزیر تھا۔ لہٰذا اس کے حقائق انتہائی جلی انداز میں روزِ روشن کی طرح کتاب کے ہر ورق پر نمایاں کر دیئے گئے۔ جبکہ حیات قبل الولادت کا علم صرف علم کی گہری پیاس رکھنے والے ذہنوں کی آسودگی کے لیے ضروری ہے۔ اور ظاہر ہے کہ "ذہنِ رسا" کے لیے "حقیقتِ خفی" کا ادراک کیا مشکل ہے!

یہی وجہ ہے کہ تصویرِ حیات کے اس رُخ کی بس کوئی جھلک ہی کہیں کہیں دکھادی گئی ہے! وحیٔ الٰہی نے حیاتِ دنیوی سے قبل کی ہماری کیفیّت کو "اَمْوَاتًا" کے لفظ سے

---

[1] "اُس کی جڑ مضبوط ہے اور ٹہنے ہیں آسمان میں" (سورۂ ابراہیم)

[2] "ہدایت ہے واسطے لوگوں کے" (سورۂ بقرہ)

تعبیر کیا ہے۔ کیسا صاحبِ عظمت اور کتنا حاملِ حکمت کلام ہے۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ	کس طرح کافر ہوتے ہو اللہ تعالےٰ
اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ	سے حالانکہ تم بے جان تھے، پھر زندہ کیا
ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ	تم کو، پھر مارے گا تم کو، پھر زندہ کرے گا
تُرْجَعُوْنَ۔ (سورۃ البقرہ)	تم کو اور پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

"اَمْوَاتًا" کے لفظ کی تفسیر جس کسی نے نُطْفًا فِي الْاَصْلَابِ[1] کے الفاظ بڑھا کر کی اس نے تو خیر پھر بھی کم از کم ایک خالص حیاتیاتی حقیقت کی طرف تو اشارہ کر دیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس نے اُسے "معدوم" کے ہم معنی قرار دیا اس نے وحیٔ الٰہی پر طبع آزمائی کرنے کی جرأت کی ہے۔

ذرا غور کرو، حیاتِ انسانی کا یہ دَور جسے ہم 'حیاتِ دنیوی' کہتے ہیں، دو موتوں کے درمیان واقع ہوا ہے۔ ایک اس سے پہلے اور دوسری اس کے بعد۔ تو ہے کوئی جو بعد والی موت کو عدم سے تعبیر کرے؟ پھر کیسا ستم ہے کہ پہلی موت کو عدم کہنے والے چاہے کم ہوں سمجھنے والے اکثر و بیشتر ہیں! واقعہ یہ ہے کہ نہ وہ موت معدوم ہونے کا نام ہے نہ یہ کیفیتِ عدم کا اظہار، نہ اِس پر زندگی ختم ہوگی نہ اُس سے اس کی ابتدا ہوئی تھی بلکہ جیسے بعد والی موت بجائے خود زندگی ہی کا ایک وقفہ ہوگی۔ اِسی طرح قبل والی موت بھی زندگی ہی کا ایک دَور تھی اور جس طرح آنے والی موت کے بعد حیاتِ اُخروی کو شروع ہونا ہے بالکل اسی طرح گزشتہ موت سے قبل بھی ایک زندگی تھی جس کا سب سے بڑا واقعہ وہ عہدِ الست ہے جس کی خبر وحیٔ الٰہی نے دی اور جس کی یاد فطرتِ انسانی کی گہرائیوں میں محفوظ ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ	اور جب نکالا تیرے رب نے بنی آدم کی
مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ	پیٹھوں سے اُن کی اولاد کو اور اقرار

---

[1] آبا ؤ اجداد کی پیٹھوں میں بشکل نطفہ (تفسیر جلالین)

عَلٰۤى اَنۡفُسِهِمۡ اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ	کرایا ان سے ان کی جانوں پر۔ کیا میں
قَالُوۡا بَلٰى شَهِدۡنَا	نہیں تمہارا رب؟ بولے ہاں ہے ہم
(سورۃ الاعراف)	اقرار کرتے ہیں۔

تو کون کہہ سکتا ہے کہ جب یہ میثاق لیا گیا اس وقت عہد کرنے والوں کو اپنی ہستی کا شعور نہ تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو کیا اس عہد و میثاق کی کوئی حیثیت اور اہمیت ہو سکتی تھی جو کلام الٰہی کے سلسلۂ استدلال کی ایک اہم کڑی ہے! یقیناً وہاں ہر انسان نے اپنی ہستی اور تشخص کے شعور کے ساتھ عہد باندھا تھا۔ تو پھر "حیات" کیا کسی اور چیز کا نام ہے؟

اس حیاتِ اوّلیں کے اثبات پر قرآنِ حکیم کی وہ آیۂ کریمہ دلیلِ قطعی ہے جس میں اہلِ جہنم کی فریاد ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے کہ:

رَبَّنَاۤ اَمَتَّنَا اثۡنَتَيۡنِ وَاَحۡيَيۡتَنَا	اے رب ہمارے تو موت دے چکا ہم
اثۡنَتَيۡنِ فَاعۡتَرَفۡنَا بِذُنُوۡبِنَا	کو دو بار اور زندگی دے چکا ہم کو دو بار۔
فَهَلۡ اِلٰى خُرُوۡجٍ مِّنۡ سَبِيۡلٍ	اب ہم قائل ہوئے اپنے گناہوں کے پھر
(سورۃ الغافر)	اب بھی ہے نکلنے کو کوئی راہ؟

ذرا 'وجود' اور 'ہستی' کے اس تسلسل پر غور کرو، جو اس آیۂ مبارکہ کے جامِ حقیقت نما سے چھلکا پڑ رہا ہے ؎

نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے ۔۔۔ اِک ذرا چھیڑ تو دے زخمۂ مضرابِ حیات

ہم پورے شعورِ حیات کے ساتھ موجود تھے، پھر ہم پر "اماتۂ اولیٰ" کا عمل ہوا اور ہم ایک طویل عرصے کے لیے 'پہلی موت' کی گود میں سو گئے۔ پھر "احیائے اولیٰ" ہوا اور ہم حیاتِ دنیوی کی "بساطِ ہوائے دل" پر 'وارد' ہو گئے۔ پھر "اماتۂ ثانیہ" ہو گی اور ہم پھر اِک بار موت کی نیند سو جائیں گے اور پھر "اِحیاءِ ثانی" کا صور پھونکا جائے گا اور ہم 'زندۂ جاوید' ہو جائیں گے۔

حقیقتِ موت

ذرا ٹھہرو! حیات کی عظمت کے ساتھ ساتھ موت کی حقیقت بھی دیکھ لو۔ یہ زندگی کا ایک 'وقفہ' ہی نہیں، سلسلۂ حیات کی ایک کڑی اور زندگی ہی کی ایک شکل ہے، بالکل نیند سے مشابہ، اب ذرا تلاوت کرو آیۂ کریمہ :

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ	اللہ کھینچ لیتا ہے جانیں جب وقت ہو
مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا	اُن کے مرنے کا اور جو نہیں مرے اُن کو
(سورۃ الزمر)	کھینچ لیتا ہے اُن کی نیند میں۔

اور گوشِ حقیقت نیوش سے سُنو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ :

وَاللّٰهِ لَتَمُوْتُنَّ كَمَا تَنَامُوْنَ ثُمَّ	خدا کی قسم تم لازماً مر جاؤ گے جیسے تم سو
لَتُبْعَثُنَّ كَمَا تَسْتَيْقِظُوْنَ۔	جاتے ہو۔ پھر یقیناً اٹھائے جاؤ گے جیسے
(حدیث)	تم نیند سے بیدار ہوتے ہو۔

اور یاد کرو آپؐ کی وہ دُعا جو آپؐ کی ہر صبح کا معمول تھی :

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْيَانِیْ بَعْدَمَا	تعریف ہے اللہ کی جس نے مجھے زندگی
اَمَاتَنِیْ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ۔	عطا فرمائی، اس کے بعد کہ مجھ پر موت
(حدیث)	طاری فرمادی تھی۔

شاید حقیقت کی کوئی جھلک دیکھ لو!

اللہ اکبر! کیا "ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ" کا گُھپ اندھیرا طاری ہے اِن ذہنوں پر جو موت اور زندگی کو عدم اور وجود کے ہم معنی سمجھ بیٹھے ہیں!

حقائق کے اس طرح درجہ بدرجہ اور "طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" انکشاف کے بعد اب ذرا

محسوسات کی دُنیا سے "لب بہ بند و چشم بند و گوش بند!" ہو کر وجدان کی لامتناہی فضاؤں میں چشمِ تخیّل کو وا کرو اور "تسلسلِ حیاتِ انسانی" کا مشاہدہ کرنے کی کوشش کرو۔ اگر کر پائے تو ایک عجیب سا کیف محسوس کرو گے اور سرور و مستی سے ہم کنار ہو گے اور کیا عجب کہ تمہارے منہ سے نکل جائے: سُبْحَانِیْ مَا اَعْظَمَ شَانِیْ![1] تو یہی حقیقت کا ادراک ہے! ع

لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!

حقیقتِ انسان

منصور کا یہ کہنا کہ: "خدا ہوں میں!" ایک انتہا پر ——— اور ڈارون کا یہ بولنا" کہ: "بوزنا ہوں میں!" دوسری انتہا پر ——— لیکن کیا یہ معاملہ ایسا ہی غیر اہم ہے کہ کوئی "دوست" اسے ہنستے ہوئے یہ کہہ کر ٹال دیں کہ: ——— "فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست!"[2]

سوال یہ ہے کہ حقیقت یہ ہے یا وہ؟ ——— اور اگر ان دونوں کے مابین واقع ہوتی ہے تو کہاں؟ ——— اور اگر یہ دونوں ہی باتیں درست ہیں تو کیسے؟

"ایاز قدرِ خود بشناس!" کو معلوم کیوں ایک تحقیر آمیز تنبیہ ہی کے مفہوم میں لے لیا گیا ہے! کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ بحیثیّتِ انسان اپنے حقیقی مرتبہ و مقام کو پہچاننے کی مشفقانہ نصیحت

---

[1] حضرت بایزید بسطامیؒ کا مشہور قول۔

[2] حضرت اکبر الٰہ آبادی کا مشہور قطعہ ہے:

کہا منصور نے خدا ہوں میں ——— ڈارون بولا بوزنا ہوں میں
ہنس کے کہنے لگے مرے اِک دوست ——— فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست!

ہو ۔ یعنی بقول اقبالؔ ع "اپنی خودی پہچان او غافل انساںؑ" یا بقولِ بیدل ع "اے بہارِ نیستی ازخود ہشیار باش!" ــــــ اس لیے کہ یا تو یہ مانا جائے کہ محمُود اور ایاز کی روائتی محبّت بس ایک قِصّہ ہی ہے ــــــ یا پھر اس دوسرے امکان ہی کو مانتے بنے گی، کہ

نہ در بازی باوُدل داد محمُود　　　　دل محمُود را بازی مپسندار!

سب جانتے ہیں کہ 'خدا ناشناسی'، تمام بُرائیوں کی جڑ اور جُملہ گناہوں اور جرائم کی ماں ہے، لیکن بہت کم ہیں جو یہ جانتے ہوں کہ اس سب سے بڑے گناہ کی نقد سزا جو اس دُنیا ہی میں انسان کو ملتی ہے کیا ہے! 'خود فراموشی' بفحوائے الفاظِ قرآنی:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ	اور ان لوگوں کے مانند نہ ہو جانا
نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ	جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے
أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ۔	انہیں اپنے آپ سے غافل کر دیا
(سورۃ الحشر: ۱۹)	یہی لوگ بدکار ہیں۔

ہندسہ میں ہر دعویٰ (THEOREM) کا ایک عکس (CONVERSE) ہوتا ہے چنانچہ اس 'دعویٰ حق' کا عکس بھی کسی عکاسِ حقیقت کی زبانی یوُں ادا ہوا کہ:

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ	جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اُس
عَرَفَ رَبَّهُ۔	نے اپنے رَب کو پہچان لیا۔

تو کیا واقعی عرفانِ خویش اور معرفتِ رَب لازم و ملزوم ہیں اور 'حقیقتِ انسان' اور ذاتِ ربّانی میں اتنا گہرا اور قریبی تعلّق ہے؟

ان مسائل کے حل کے ضمن میں اگر انسان صرف حواسِ ظاہری سے حاصل شدہ معلومات اور محض اُن ہی پر مبنی استدلال پر دار و مدار رکھے تو جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ انسان بھی بس ایک حیوان ہے ــــــ دوسرے حیوانات کے مقابلے

ل۔ اقبالؔ کا مصرعہ ہے ع "اپنی خودی پہچان او غافل افغان!"

میں ذرا ترقی یافتہ حیوان! ـــــ البتہ وجدان کی وادیوں میں پرواز کی جائے جیسے عظیم شعراء نے کی تو حقیقت کچھ اور نظر آتی ہے ـــــ اور مسئلے کا پورا تشفی بخش حل تو وحیٔ آسمانی کی دستگیری کے بغیر ممکن ہی نہیں!

ایک 'واقف' و عارف بزرگ کے سامنے شکوہ کیا گیا: "حضرت! اب تو "انانیت" کا دَور دورہ ہے اور ہر شخص اس مہلک مرض میں گرفتار ہو چکا ہے!" ـــــ اس پر انہوں نے فرمایا: "بھائی! واقعہ تو یہ ہے کہ 'انانیت' کا دَور بھی گزر چکا، اب تو زی 'نانیت' ہی 'نانیت' رہ گئی ہے!"[1]

اس میں ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ دَورِ حاضر کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ آج کا انسان اپنے آپ کو محض ایک حیوان تصور کرتا ہے۔ انسانوں کی عظیم اکثریت تو اپنی عظمت سے بالکلیہ بے خبر اور اپنی حقیقت سے قطعی طور پر لاعلم، محض اپنی مادی ضرورتوں اور حیوانی تقاضوں کی تسکین و تکمیل کے لیے دَوڑ دھوپ میں مصروف و مشغول ہے ہی ـــــ اصحابِ دانش و بینش کی واضح اکثریت بھی کائنات کی اصل مادّی مان کر ـــــ اور مادّہ کو حقیقی قرار دے کر 'واقعیت پسندی' (REALISM) کی جانب رُخ کیے ہوتے ہے ـــــ حتیٰ کہ جنہیں اس سطح سے ذرا بلند ہونے کی توفیق ملی ہے وہ بھی ذہن (MIND) اور رُوح (SOUL) کی "عینیت" یا "ثنویت" کی بحث میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں!

اور آج کا انسان جس ذہنی و فکری ژولیدگی اور اخلاقی و عملی پستی کا شکار ہو چکا ہے اُس سے نجات کی واحد راہ اپنی عظمت کی 'بازیافت'، اور اپنے مقام و مرتبہ سے دوبارہ کما حقہٗ آگاہی کے سوا اور کچھ نہیں! ـــــ گویا ع "علاج اُس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی"!

---

[1] 'نانیت' ۔ نان سے یعنی روٹی ۔ یا بالفاظ دیگر روٹی، کپڑا، اور مکان! ۔ یہ الفاظ ہیں مولانا سید سلیمان ندوی کے ۔ بروایت ڈاکٹر سید اسلم زیدی (قومی ادارہ امراضِ قلب ۔ کراچی)

یعنی بقول اقبالؔ ـــــ "اپنی خودی پہچان او غافل انسان !" اور بالفاظِ بیدلؔ : ؏ "اے بہارِ ہستی از قدرِ خود ہشیار باش !"

حقیقت یہ ہے کہ انسان ایک 'مرکّب' وجود کا حامل ہے ـــــ بقول سعدیؒ :

؎ "آدمی زادہ طرفہ معجون است　　　از فرشتہ سرشتہ و ز حیواں !"

اس کا ایک جزو "اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡم" کا مظہرِ اتم ہے تو دوسرا "اَسۡفَلَ سَافِلِیۡن" کا مصداقِ کامل ![1]

ایک کا تعلق 'عالمِ امر' سے ہے تو دوسرے کا 'عالمِ خلق' سے ![2]

ایک خاکی ہے تو دوسرا نوری ![3]

ایک ـــــ 'دنی الطبع' ہے اور ہمہ تن اور ہر وقت پستی کی جانب مائل تو دوسرا "قدسی الاصل" اور ہمیشہ "رفعت پہ نظر" رکھنے والا ![4]

ایک حیوانات کی صف میں ہے ـــــ اور اُن میں سے بھی بہت سوں کے مقابلے میں مختلف اعتبارات سے ہیچ و کمتر اور ضعیف و ناتواں تو دوسرا ملائکہ کا ہم پلّہ ہے بلکہ مقام اور مرتبہ میں اُن سے بھی کہیں اعلیٰ و افضل ـــــ حتّٰی کہ اُن کا مسجود و مخدوم !!

ایک عبارت ہے اُس کے 'وجودِ حیوانی' سے ـــــ تو دوسرا مظہر ہے اُس 'رُوحِ ربّانی' کا جو اُس میں پھونکی گئی اور جس کی بنیاد پر وہ مسجودِ ملائک قرار پایا، بفحوائے

---

[1] سورۃ التّین آیات ۴، ۵ (ترجمہ) "یقیناً ہم نے پیدا کیا انسان کو بہترین ساخت پر پھر لوٹا دیا اُسے نیچے والوں میں سب سے نیچے"۔

[2] اَلَا لَـہُ الۡخَلۡقُ وَالۡاَمۡرُ (سورۃ الاعراف : ۵۴)

[3] خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات　　　ہر دو جہاں سے غنی اُس کا دِل بے نیاز　(اقبالؔ)

[4] ؏ "قدسی الاصل ہے رفعت پہ نظر رکھتی ہے"۔

الفاظِ قرآنی :

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ	اور جب میں اسے پوری طرح
فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ	بنا لوں اور اُس میں اپنی رُوح میں
سٰجِدِيْنَ	سے پھونک دُوں تب گر پڑنا اُس
(سورۃ الحجر : ۲۹، ص : ۷۲)	کے سامنے سجدے میں۔!

اب ـــــــ اصحابِ دانش و بینش میں سے جن کی نظر اپنے وجود کے 'عُلوی' جزو پر جم کر رہ گئی اور وہ اُس کی عظمت و رفعت کے مشاہدے میں محو ہو کر رہ گئے اُن میں سے کوئی حیران ہو کر پکار اُٹھا "سبحانی ! ما اعظم شانی !" کسی نے جذب و مستی کے عالم میں نعرہ لگا دیا "انا الحق"! اور کوئی کیف و سرور سے سرشار ہو کر کہہ بیٹھا "لَيْسَ فِي جُبَّتِي الا الله !"[1] ـــــــ اور جن کی نگاہِ تحقیق و تفتیش انسان کے وجودِ حیوانی ہی پر مرتکز رہی اور وہ اسی کے بارے میں بحث و تمحیص اور اسی کے متعلق تفحّص و تعمّق میں گم ہو کر رہ گئے انہیں اس کا تعلّق لا محالہ بندروں، بن مانسوں اور گوریلوں ہی سے جوڑتے بنی !!

گویا 'حقیقتِ انسان' کے ضمن میں متذکرہ صدر متضاد آرا، جزوی طور پر اپنی اپنی جگہ صحیح بھی ہیں اور کلّی اعتبار سے غلط بھی ! اور مسئلہ زیرِ بحث کا کوئی حل اس کے بغیر ممکن نہیں کہ انسان کو دو 'متضاد' اجزاء سے 'مرکّب' تسلیم کیا جائے !

واضح رہے کہ وجودِ انسانی کے یہ دونوں اجزائے ترکیبی ایک دوسرے سے بالکل آزاد اور اپنی اپنی جگہ کامل اور ہر اعتبار سے خود مکتفی ہونے کے باوصف غایت درجہ متصل ہی نہیں باہم دگر پیوست ہیں ـــــــ فہمِ انسانی کے عظیم ترین مغالطوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ رُوحِ انسانی کو 'جان' کے ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ 'جان' یا 'زندگی' یا

---

[1] منصور حلاج اور اکابر صوفیا کی شطحیات ۔ یعنی وہ جملے جو جذب و مستی کے عالم یعنی حالتِ سکر میں ان کے منہ سے نکل گئے۔ ان میں سے منصور کو اس لیے دار پر چڑھنا پڑا کہ وہ حالتِ صحو میں بھی اسی مؤقف پر قائم رہا۔!

(LIFE) تو انسان کے وجودِ حیوانی کا جزو لاینفک ہے ـــــــ اور رُوحِ انسانی اپنا جداگانہ اور مستقل بالذّات وجود رکھتے ہوئے اُس وجودِ حیوانی کے ساتھ "اتّصالے بے تکیّف بے قیاس"[1] کے رشتے میں منسلک ہے ـــــــ رُوح کے وجودِ حیوانی کے ساتھ اس اتّصال کے ضمن میں "کہاں" اور "کیسے" کے سوالات ویسے ہی لاینحل ہیں جیسے خود یہ سوال کہ جان اور جسم کا تعلّق کس نوعیّت کا ہے اور کس عضو سے متعلّق ہے۔ اگرچہ بہت خوب کہا ہے کسی کہنے والے نے کہ :

جاں نہاں در جسم اُو در جاں نہاں   اے نہاں اندر نہاں اے جانِ جاں!!

مزید برآں ـــــــ انسان کے یہ دونوں وجود 'دانا' و 'بینا' ہیں۔ اس کی آنکھیں صرف ظاہری یا حیوانی دیکھنا دیکھتی ہیں ـــــــ اور کان صرف ظاہری یا حیوانی سننا سنتے ہیں اور یہ دونوں حواس ظاہری اپنی حاصل کردہ معلومات (SENSE DATA) کو عقلِ حیوانی یعنی دماغ (BRAIN) کے حوالے کر دیتے ہیں جو اُن سے نتائج اخذ کرتا ہے جبکہ رُوحِ انسانی بھی نہ صرف دیکھتی اور سُنتی ہے ـــــــ اور اس کا یہ دیکھنا اور سننا ظاہری آنکھوں اور کانوں سے بالکل آزاد ہے[2] ـــــــ بلکہ تعقّل اور تفقّہ بھی کرتی ہے جس کا کوئی تعلّق عقلِ حیوانی یا دماغ سے نہیں ہے ـــــــ رُوح کے آلۂ بصارت و سماعت اور تعقّل و تفقّہ کا نام اِصطلاحِ قرآنی میں 'قلب' ہے۔ بفحوائے آیاتِ قرآنی :

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ   اُن کے دِل ہیں لیکن ان سے

---

[1] "اتصالے بے تکیف بے قیاس   ہست ربّ النّاس را با جانِ ناس"   رومی

[2] دم چیست ؟ پیام است ! شنیدی نشنیدی !
در خاکِ تو یک جلوۂ عام است ! ندیدی !!
دیدن دگر آموز ! شنیدن دگر آموز !!   اقبال

بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا	سوچتے نہیں، اور ان کی آنکھیں ہیں
يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ	پر ان سے دیکھتے نہیں، اور ان کے
اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا	کان ہیں مگر ان سے سُنتے نہیں! یہ
اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ	چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے
هُمْ اَضَلُّ۔ (سورۃ الاعراف: ۱۷۹)	بھی گئے گزرے!
اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ	تو کیا انہوں نے زمین میں سفر
فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ	نہیں کیا۔ پھر اگر ان کے دل
يَّعْقِلُوْنَ بِهَا اَوْ اٰذَانٌ	(بیدار) ہوتے تو ان سے سوچ بچار
يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ فَاِنَّهَا	کرتے یا ان کے کان ہوتے جن
لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ	سے سُنتے، اس لیے کہ (اصل میں) آنکھیں
تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي	اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو
الصُّدُوْرِ (سورۃ الحج: ۴۶)	جاتے ہیں جو سینوں میں ہوتے ہیں!

یہی نہیں ـــــــ بلکہ وحیٔ جلی اور وحیٔ خفی کے اشارات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ 'قلب' ـــــــ رُوحِ انسانی کے لیے صرف ذریعۂ سماعت و بصارت اور آلۂ تعقّل و تفقّہ ہی نہیں، اس کا مسکن بھی ہے اور اُس کی مثال قندیل کے اس شیشے کی سی ہے جس کے اندر کوئی شمع روشن ہو ـــــــ چنانچہ اگر رُوحِ انسانی کو اُس چراغ سے تشبیہہ دی جائے جس میں نورِ خداوندی جلوہ فگن ہے تو قلبِ مصفّیٰ و مجلّیٰ کی مثال اس صاف و شفّاف شیشے کی ہے جو رُوح کے انوار سے اس طرح جگمگا اُٹھتا ہے کہ انسان کا پُورا وجودِ حیوانی بھی انوارِ الٰہیّہ سے منوّر ہو جاتا ہے ـــــــ چنانچہ یہی مفہوم ہے اس عظیم تمثیل کا جو سورۃ نور میں وارد ہوئی ہے:

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِؕ	اللہ ہی آسمانوں اور زمین کا نور
مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ	ہے۔اس کے نور کی مثال
فِيْهَا مِصْبَاحٌؕ اَلْمِصْبَاحُ	(قلبِ مومن میں) یوں ہے جیسے
فِيْ زُجَاجَةٍؕ اَلزُّجَاجَةُ	ایک طاق ہو جس میں ایک دیا ہو،
كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ	وہ دیا ایک شیشے میں ہو، (اور)
(سورۃ النور : ۳۵)	وہ شیشہ ایسے ہو جیسے ایک چمکتا ستارا!

(اس آیۂ مبارکہ کے ضمن میں بالکل صحیح ہے وہ رائے جو اکثر متقدمین نے دی ہے کہ "مَثَلُ نُوْرِهٖ" کے بعد "فی قلب المؤمن" کے الفاظ مقدر و محذوف ہیں!)

اس کے برعکس اگر شیشۂ قلب فسق و فجور کی کثرت، خواہشات کی پرستش اور شہوات کے اتباع کے باعث داغدار اور مکدر ہو جاتا ہے تو روح کے انوار کے انسان کے وجودِ حیوانی میں سرایت کرنے میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے اور اس کیفیت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اس طور سے جس کی وضاحت وحیٔ خفی یعنی اس حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ملتی ہے[1]:

ان المؤمن اذا اذنب كانت	مومن جب کوئی گناہ کرتا ہے تو
نكتة سوداء فی قلبه	اس کے دل پر ایک سیاہ داغ پڑ
فان تاب واستغفر	جاتا ہے۔پھر اگر توبہ و استغفار کرتا ہے
صُقل قلبهٗ وان	تو دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر اور
زاد، زادت حتی تعلو	گناہ کرتا ہے تو (دل کی) سیاہی بھی بڑھتی
قلبهٗ فذالكم الرّان	چلی جاتی ہے یہاں تک کہ پورے

---

[1] رواہ احمدؒ والترمذیؒ وابن ماجہؒ عن ابی ہریرہؓ وقال الترمذیؒ، ہذا حدیث حسن صحیح

الّذی ذکر اللہ تعالیٰ	دل پر چھا جاتی ہے چنانچہ یہی ہے
"کلّا بل ران علیٰ قلوبھم	وہ دلوں کا زنگ جس کا ذکر اللہ
مّا کانُوا یکسبون۔"	نے اس آیۂ مبارکہ میں فرمایا ہے۔

(سورۃ المطففین : ۱۴) "نہیں بلکہ زنگ لگ گیا ہے اُن کے دلوں پر ان کے اعمال کے سبب سے!"

اور اس عمل (PHENOMENON) کی یہی وہ منطقی انتہا ہے جسے وحیِ جلی میں ختمِ قلوب اور طبعِ قلوب سے تعبیر فرمایا گیا —— بفحوائے الفاظِ قرآنی:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى	اللہ نے مہر کر دی ہے ان کے
سَمْعِهِمْ وَعَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ	دلوں پر اور ان کے کانوں پر۔ اور
غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ	ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔ اور ان
عَظِيْمٌ (سورۃ البقرہ: ۷)	کے لیے بہت بڑی سزا ہے۔
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى	یہی ہیں وہ لوگ جن کے دلوں،
قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِ	کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے مہر لگا
هِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ۔	دی ہے اور وہی ہیں (حقائق و
(سورۃ النحل: ۱۰۸)	معارف سے) غافل و بے خبر!

اور یہی وہ کیفیت ہے جسے قرآن انسان کی 'رُوحانی موت' سے تعبیر فرماتا ہے اس لیے کہ اس حال میں انسان کے وجودِ حیوانی کا اُس رُوحِ ربانی سے تعلق بالکل منقطع ہو جاتا ہے جس نے اُسے شرفِ انسانیت عطا فرمایا تھا۔ اور اُس کا نہاں خانۂ قلب رُوح کی قبر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ نتیجۃً انسان کی صورت میں ایک دو ٹانگوں پر چلنے والا حیوان باقی رہ جاتا ہے جو 'حقیقتِ انسان' کے اعتبار سے ایک چلتے پھرتے مقبرے اور متحرک 'تعزیے' کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ !!

چنانچہ ایسے ہی حقیقت کے اعتبار سے مُردہ اور ظاہری اعتبار سے زندہ انسانوں کا ذکر ہے ان آیاتِ قرآنیہ میں :

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى۔	(اے نبیؐ) آپؐ نہیں سنا سکتے اِن
(سورۃ النمل : ۸۰)	مُردوں کو !
فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى	تو (اے نبیؐ) آپؐ نہ ان مُردوں
وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ۔	کو سنا سکتے ہیں اور نہ ان بہروں تک
(سورۃ الروم : ۵۲)	اپنی دعوت پہنچا سکتے ہیں۔!

جنہیں بعض لوگ خواہ مخواہ گھسیٹ لے جاتے ہیں 'سماعِ موتیٰ' کے ایک اختلافی مسئلے پر بحث مباحثے میں !

الغرض! جب تک کوئی شخص انسانی شخصیت کے ان دو متضاد اجزائے ترکیبی کو نہ جان لے وہ دین و مذہب کے لطیف تر حقائق اور وحیٔ آسمانی میں وارد شدہ معارف و حِکَم کا کما حقّہٗ ادراک نہ کر سکے گا۔ اور بایں محرومی و تہی دستی اگر مقامِ دعوت پر فائز ہو جائے گا تو اس کی تمام تر گفتگو احکامِ شریعت اور نظامِ اسلام کے بارے میں ہو گی حقائقِ ایمانی کا تذکرہ ہو گا بھی تو بس سرسری سا ——— اور اگر شارح و مفسّرِ قرآن بن بیٹھے گا تو لغت و نحو کے اشکالات، معنی و بیان کے لطائف اور فصاحت و بلاغت کے نوادرات سے تو خوب بحث کرے گا لیکن فلسفہ و حکمتِ دین کے لطیف و غامض نکات اُس کی نگاہ سے اوجھل رہ جائیں گے اور حقائق و معارفِ ایمانی کے اعتبار سے اہم ترین مقامات سے وہ ایسے گزر جائے گا جیسے وہاں کوئی لائقِ توجّہ بات ہے ہی نہیں !

فَاعْتَبِرُوْا يَا اُولِى الْاَبْصَارِ !!

حدیثِ قدسی

" الصَّومُ لی و أنا أجزی بہ "

میں مضمر

حکمتِ دین کے بیش بہا خزانے

کے حصول

اور ''اپنی خودی پہچان' او غافل انسان!'' کے مصداق

عظمت انسان

سے واقفیت کے لئے

ڈاکٹر اسرار احمد

کی ''بقامت کہتر و لے بقیمت بہتر'' تحریر

عظمتِ صوم

کا مطالعہ فرمائیں

شائع کردہ: **مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور**

36-K ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 03-5869501